حامد سراج

دہاڑی

خزاں اور بہار کی درمیانی رت تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا سے خزاں رسیدہ پتے درختوں سے ٹوٹ کر میرے اردگرد سرنگوں رہے تھے۔ شیشم کی اونچی شاخ پر ایک پرندہ چونچ میں دانہ لئے آیا۔ خزاں رسیدہ درخت کی ننگی ٹہنیوں پر وہی ایک گھونسلہ بہار کی علامت تھا۔ اس میں زندگی اور بہار کے آثار تھے۔ لان کے اطراف میں لگے اکا دکا گیلی کے پودوں پر سرخ اور پیلے پھول کھلے تھے۔ میں ایک رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ خزاں رسیدہ پتوں کی طرح رسالے کے اوراق بھی پھڑ پھڑا رہے تھے اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں یا سوچ رہا ہوں۔ شاید میں کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔۔ میں کچھ نہ کچھ تو کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں تحریروں کا ایک جال بچھا تھا، پرندے بول رہے تھے اور میں سلیمان نہ تھا کہ ان کی بولی سمجھ لیتا۔ وہ یقینی طور پر ایک دوسرے کو اپنی کتھا سنا رہے تھے۔ بان کی کھردری چار پائی کی پائنتی رکھی ٹرے میں چائے کی پیالی سرد ہو گئی تھی۔ میری خواہش تھی کہ جیسے ہی کسی پرندے کی چونچ سے کوئی کہانی گرے میں اسے اٹھا کر سنبھال لوں اور مکمل کر کے کسی جریدے میں اشاعت کے لئے بھیج دوں۔ لیکن خیال آیا۔۔۔۔ یہ شوق نام وری کس لئے۔۔۔۔؟ کسی پرندے کی چونچ سے گری ہوئی کہانی تو میری اپنی سوغات ہے میں اسے عام کیوں کرنا چاہتا ہوں۔ میں ایسی کہانیاں سنبھال کر کیوں نہیں رکھتا۔ کیا یہ تحریریں بھی کسی کی امانت ہیں؟ جو ہمیں لوٹانی ہیں۔ تخلیق کار کو معلوم ہی کب ہوتا ہے کہ وہ کس لئے تخلیق گری کے عمل سے گذر رہا ہے؟ اپنی ذات کی تشہیر کے لئے؟ معاشرے یا پھر کائنات کے لئے۔۔۔۔؟ میرے آنگن میں کوئی پنجرہ نہیں۔۔۔۔۔ میں نے پرندے کبھی قید نہیں کئے۔ بچپن میں چین کے طوطے جو پیغام لائے تھے، وہ میں آج تک نہیں بھولا۔ مجھے قید سے نفرت ہے۔۔۔ قید جبر کی علامت ہے، پرندے اور کہانیاں قید نہیں کرنے چاہئیں۔ یہ قید ہو جائیں تو فضا میں گھٹن بڑھ جاتی ہے جس سے دم رکنے لگتا ہے۔ میں گھر کے آنگن میں مٹھی بھر باجرہ بکھیر دیتا ہوں، پرندے دانا چگتے، چہچہاتے اور مجھے کہانیاں سناتے رہتے ہیں۔ کہانی تلاش کرنے کے لئے میں اٹھا، اندر سے باجرہ نکال کر صحن میں بکھیر دیا۔ تھوڑی دیر میں چڑیاں، لالیاں، کال کھڑچی، کوے اور ہدہد میرے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ ابھی وہ دانہ چگ ہی رہے تھے کہ ایک دم اڈاری مار کر اڑ گئے۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا۔۔۔۔ سامنے پگڈنڈی پر ایک شخص آ رہا تھا۔۔۔۔ دھیمی چال چلتا ہوا۔۔۔۔ آہستہ آہستہ اس کے نقوش واضح ہونے لگے۔ اس کے پاؤں میں گانٹھ لگی چپل، سر پر بوسیدہ میلی سی پگڑی اور بغل میں خالی بوریاں تھیں۔ پرندوں کی جگہ چار پائی پر وہ آ کر بیٹھ گیا۔ کہانیاں پرندے اپنے ساتھ لے اڑے اور میں رسالے کے اوراق میں سے پرندے تلاش کرنے لگا۔

اتنے میں، خزاں کی خامشی میں ایک آواز ابھری "چار چار روپے۔۔۔۔ "سستیاں لے لو۔۔۔۔ چار چار روپے۔ میرا جی چاہا اٹھ کر ایک چنگیر لے لوں۔ ممکن ہے چنگیر میں روٹی کی بجائے کوئی کہانی رکھی ہو۔ اور بیچنے والی کی جیب میں رقم کی بجائے بھوک رکھی ہو۔۔۔۔ وہ خزاں رسیدہ چہرے والی ایک پستہ قد عورت تھی اس کے کپڑوں میں جگہ جگہ پیوند لگے تھے۔ وہ گذر گئی۔ میں چنگیر سے کہانی اٹھا سکا نہ اس کی جیب سے بھوک۔ دیر تلک اس کی پشت پر لٹکتے جھولے اور سر پر دھری چنگیروں کو دیکھتا رہا۔ رسالے کے اوراق چپ ہو گئے۔۔۔۔ گونگے اور